R. No. 2166/57 — Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت [illegible]

[illegible]

جلد ۲۵ - شمارہ ۲۴ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۲۲ جون ۱۹۶۶ء

آل احمد سرور

نظم کی زبان

(۲)

دوسرے ان شاعروں کو اپنی بات کہنے اور منوانے کے لیے اشاروں، کنایوں، جھلکیوں، حیرت ناک جلووں کے بجائے مسلسل اظہار (تعمیری اظہار، آغاز، وسط، انجام، گویا فارم کے ایک ٹھہرے تصور کو اپنانا پڑے گا۔ اور اس لیے نظم کو ایک چھوٹی مثنوی یا مسدس یا چند یوں ہی سے مربوط بندوں سے آگے بڑھا کر بے قافیہ یا آزاد نظم کو اور ترقی دینا پڑے گی۔ اردو دنیا چونکہ قدامت پرست اور روایت پرست زیادہ ہے، اس لیے اس نے بے قافیہ یا آزاد نظم کی تحریک کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے آزاد نظم فن کے قیود سے آزادی کا نام نہیں، بلکہ فن کے ساتھ ایک تازہ اور دوسروں سے زیادہ گہری وفاداری کا نام ہے۔ یہ چند معمولی قیود سے آزادی اس لیے حاصل کرتی ہے کہ بعض گہری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ شاعری کی تیسری آواز کی مکمل نمایندگی بے قافیہ یا آزاد نظم ہی میں ہو سکتی ہے۔ ہماری مثنویوں میں ہزاروں اشعار ملتے ہیں، مگر مصرعوں کی برابری اتنی ہی اکتا دینے والی ہوتی ہے جتنی اٹھارویں صدی کی باقاعدہ، ہموار، قدم ملا کر چلنے والی شاعری جب ارکان کی برابری اکتا دینے والی اور خیال کو برابر برابر ٹکڑوں میں کاٹنے والی ہے، تو قافیے کی معمولی سی پابندی بھی ذہنی زد پر بند باندھنے والی ہے۔ یہاں ردیف یا قافیے کو ترک کر دینے کا سوال نہیں ہے، نہ پابند شاعری کو ادب بدر کرنے کی تجویز میں تو عظمت اللہ خاں کی طرح یہ بھی کہنے کو ہرگز تیار نہیں کہ غزل کی گردن بے تکان مار دینا چاہیے۔ یہاں صرف زبان اور فن کے تصور میں توسیع کا سوال ہے۔ اگر ہمارے اصناف سخن پر سے قافیے، ردیف اور بحروں کی یہ آمریت کم ہو جائے جس کے شکنجے میں الفاظ کا گودا نکل جاتا ہے اور معانی کی ہڈیوں کی مالا بناتے رہتے ہیں، تو ہیئت سندی صاحب کو اس لیے کہ نہ کوئی ٹکسالی کہیں آگینہ پگھل جائے، نہ خیالات پر اتنے بند باندھے پڑیں گے نہ اس کو ٹکڑوں میں پیش کرنے پر قناعت کرنی پڑے گی، نہ وہ فن کی مجبوریوں کی وجہ سے کچھ سے کچھ ہو جائے گا بلکہ اسے اپنی پوری تاثیر اور تیزی دکھانے کا موقع ملے گا۔

بے قافیہ اور آزاد نظم کی کوشش اور کامیاب ہوتی، اگر اس کی بنیاد بول چال کی زبان پر قائم ہوتی، مگر نہ صرف اس کی بنیاد بول چال کی زبان پر

نہیں رکھی گئی، بلکہ اس کے موضوعات بھی اکثر ایسے چنے گئے جو عام زندگی کے موضوعات نہیں تھے۔ یہ کچھ مریض اور رنجور ذہنوں کی بے راہ روی کو چھپانے کے لیے ایک دبیز پردہ بن گئے۔ راشد کا ذہن اقبال کے ذہن سے مختلف ہے مگر ان کی زبان اقبال سے کم فارسی آمیز نہیں ہے اور چونکہ ان کے یہاں اقبال کی طرح ابلاغ کی کوشش نہیں ہے اس لیے اپنے ذہن کی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے انھیں خاصی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ "اور ایسے ایران میں اجنبی تک کے راشد میں خاصا فرق ہے۔ ایران میں اجنبی کا راشد اپنے تجربے کا بوجھ پھینک کر سبکدوش ہونا ہی نہیں چاہتا، وہ کچھ کہنا، کچھ بتانا بھی چاہتا ہے" اس لیے اس کے یہاں تراکیب کی طلسم بندی کم ہے، مگر چونکہ وہ اپنے خول سے نکلنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے، اس لیے وہ کتابی زبان کی پناہ لینے پر اب بھی مجبور ہے۔ میرا جی اس لحاظ سے زیادہ کامیاب ہے۔ ان نظموں کو چھوڑ کر جن میں جنسی تجربے رمزیہ اسلوب میں بیان کیے گئے ہیں، وہ خاصی صاف ستھری زبان لکھتا ہے۔ اور کلرک کا نغمۂ محبت جیسی نظموں میں وہ کامیاب بھی ہے اور موضوع سے انصاف کرنے والی زبان کے استعمال پر قادر بھی۔

راشد اور میرا جی کی تو کچھ اپنی الجھنیں تھیں جن سے وہ مجبور رہے،

اس شمارے میں

مگر سیاست کے شاعروں نے بھی ادبی بساط پر کچھ کم دھاندلی نہیں کی۔ اقبال کی زبان اور جوش کی زبان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں، مگر دونوں کے پیغام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال بھی جوش کی طرح حال کے درد سے آگاہ ہیں، مگر ان کے نزدیک اس کا علاج ماضی کو یکسر نذر آتش کر دینے میں نہیں، ماضی سے صالح بنیادی قدریں لے کر، حال کی دلدل میں راستہ بنانا ہے۔ وہ جب کہتے ہیں کہ اہل نظر تازہ بستیاں آباد کریں گے، تو وہ بستیاں گو بغداد نہ ہوں گی، مگر ان میں گونہ بغداد نئے رنگ میں ہوں گے۔ جوش ماضی سے بیزار ہیں، اس کے باوجود ماضی کی زبان سے اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی، تو وہ تیوری پر بل ڈال کر فرماتے ہیں کیا میدان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ جوش زندگی کی ترجمانی کے دعوے دار ہیں، مگر کتابی زبان لکھتے ہیں۔ اقبال ایلیٹ کے الفاظ میں رجعی شاعر ہیں، جوش خوشہ چیں شاعر ہیں۔ جوش کے یہاں نئی زندگی ایک نیا لبادہ ہے جس کے چاک سے جا بجا پرانا پیراہن جھانکتا ہے۔ اسی طرح بعض ترقی پسند شعرا نے عوامی زبان یا عوامی موضوعات استعمال کر کے غلطی نہیں کی، بلکہ غلطی یہ کی کہ انھوں نے ان موضوعات اور زبان کو ایک تو چند سیاسی اور وقتی مقاصد کے لیے استعمال کیا، اس دھارے کو جو اپنی موج میں بہہ رہا تھا، پشتے باندھ کر اسے اپنے نزدیک سیدھے راستے پر ڈال دیا اور اس طرح اس کے حسن کو غارت کر دیا۔ دوسرے انھوں نے کتابی ذہن کو عوامی زبان میں داخل کر کے ایسی شاعری کو جنم دیا جس میں سیاست کی بدصورتی تھی، اس کا ذہن نہ تھا، جس میں عوام کی زبان کا چھلکا تھا، اس کا رس غائب ہو گیا تھا۔ عوامی شاعری کتابوں، سیاسی دستاویزوں، پارٹی کے پروگرام میں شرکت ہی سے نہیں ہوتی، ان کے باوجود بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ شاعر اس طرح "عوام" بن جائے جس طرح فلابیر نے کہا تھا کہ میں مادام بواری ہوں، یا جس طرح رومین رولاں نے کہا تھا کہ میں اینٹ ہوں۔ اس کے لیے ورکشاپوں اور دفتروں، ڈرائنگ روم اور پارٹی آفس میں محصور ذہن کافی نہ تھا۔ جوش اور چند ترقی پسندوں کی مثال جنھوں نے سیاسی موضوعات پر پابند اسالیب میں طبع آزمائی کی یا آزاد نظموں اور عوامی گیتوں کے پردے میں فارمولے کی شاعری کی، اس لیے عبرت ناک ہے، کیونکہ کچھ لوگوں نے اس سے غلط نتیجہ بھی نکالا۔ انقلابی شاعری کے لیے جس ذہن کی ضرورت تھی، وہ صحیح معنی میں انقلابی نہ تھا بلکہ شخصی تھا۔ اس کے لیے جس زبان کی ضرورت تھی وہ وہی مانوس زبان تھی جو مشاعرے کی مجلسی تفریح کے کام آ سکتی تھی، ذہن میں روشنی نہیں کر سکتی تھی، اور اس کے تجربے بھی پوری ایمانداری سے نہیں کیے گئے۔ ان تجربوں کی کامیابی کے لیے ذہن کی ایک شمع بجھانی اور دوسری جلانی تھی۔ شہریت کی مصنوعی فضا اور اس کے پرشور ذہن کی جگہ دیہات کی سادہ بے جھجک اور معصوم فضا جذب کرنی تھی، یہ تجربہ اس لیے ناکام نہیں رہا کہ اس میں کامیابی کا امکان نہ تھا، بلکہ اس لیے کہ یہ ایمانداری سے نہیں کیا گیا اور زیادہ لوگوں نے مزید تماشا یہ کیا کہ فصل ابھی پوری پکی بھی نہ تھی کہ اس کا نیلام بھی ہو گیا۔

جدید ہندستان میں تہذیبی سرگرمیوں کا جو احیا ہوا ہے، اسے کچھ لوگ خواہ کتنی ہی حقارت سے دیکھیں مگر یہ آزاد ہندستان کی فطری کوشش ہے اپنی قدروں کو استوار کرنے کی، اپنے آپ کو پانے کی، اپنے محدود، مصنوعی اور کاروباری ماحول میں، سارے ملک کے درد و داغ اور سوز و ساز کو سمیٹنے کی، یہ تہذیب کے صحیح تصور تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ یہ ادب کو تہذیب کے جامع تصور کے ذریعے سے فنون لطیفہ کے جانے پہچانے آزمودہ تجربات اور بصیرتوں سے بھرپور، محنت، خدمت، دکھ اور ولولے کے خزانوں سے مالا مال کرنے کی کوشش ہے۔ یہ مغرب کے ان تجربوں سے جن کو عام ذہن کتابوں سے حاصل کرتے ہیں، کہیں زیادہ صحت مند ہے۔ اس تہذیبی بساط میں انسان دوستی کے، رواداری کے، کثرت اور وحدت کے جو نقش ابھرتے ہیں، وہ قومی سالمیت کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے راستے سے مغرب کے تجربوں سے بھی صحیح معنی میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

میں یہ نہیں مانتا کہ اردو شاعری کی زبان بدیسی ہے، لیکن یہ ضرور مانتا ہوں کہ اردو شاعری کی زبان مجموعی طور پر ہمارے دیس کے ایک محدود طبقے یعنی شمالی ہند کے شہروں کے متوسط طبقے کے فکر و ذہن کی نمائندگی کرتی ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جس طرح جدید انگریزی شاعری ادبی ہوتے ہوئے بھی عام فہم ہے، اسی طرح سے ہماری شاعری نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہماری زبان میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہماری پوری تہذیبی بساط کی آئینہ داری کر سکے۔ ہاں اس کے لیے ہمارے شاعروں کو شاعری کی طاقت، فضیلت اور عظمت میں یقین اور اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ خون جگر مال تجارت ہو یا نہ ہو، اس سے قانون باغبانی صحرا، تو بہر حال لکھا جاتا رہے گا، اسے لاکھ منفعتی دور کی بے رخی اور سنگدلی سے سابقہ پڑے، وہ اس کے تیشوں سے جوئے شیر نکالتا ہی رہے گا کیونکہ عشق کے امتحان کبھی ختم نہیں ہوتے، مگر اسے یہ فیصلہ ضرور کرنا پڑے گا کہ کیا وہ اپنے دور کی ترجمانی میں صرف خفقان صحت کے دارو کا فرض سرانجام دینے کو کافی سمجھتا ہے، یا ہیڈ ماسٹر کی چمکتی ہوئی وردی اور اس کے گرد ہجوم سے مرعوب ہے، یا اسے اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا سماج سے انتقام اس طرح لینا ہے کہ ہر خوشۂ انگور کو کھٹا بنا دے کیونکہ اس نے اسے چکھا نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ سردی میں کپکپاتے ہوئے بھی جشن کے چراغاں کی تابناکی پہ وجد کرتا رہے یا کسی کے اشارے پر سرکاری اسکیموں کی کامیابی کے راگ گائے۔ اس کی وفاداری اپنی ذات سے، اپنے علاقے سے، اپنی برادری ہی سے نہیں، اس پورے ملک سے ہوگی جس کے جلوۂ صد رنگ میں اس کی بھی بہار ہے، جس کے چمن میں اس کے بھی پھول ہیں۔ وہ اگر قومی جمہوریت اور اجتماعی تصور کو اپنائے گا تو اسے فکر و فن کے لیے لامحدود فضا ملے گی۔

میں نے نظم کی زبان کے سلسلے میں زبان کے صحیح تصور، تہذیبی پس منظر، موضوعات، قومی نقطۂ نظر، عوامی بساط کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ میرے خیال میں زبان کا تصور ان چیزوں کے بغیر ناقص رہتا ہے۔ ان کے سہارے ہم آسانی سے نہ صرف اپنے دور کی نمائندگی میں کامیاب ہو سکتے ہیں، بلکہ آنے والوں کی راہ کے بھی بہت سے کانٹے نکال دے سکتے ہیں۔ یہیں الفاظ کی صحت اور غلطی کے

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲)

وصی الحسن

کچھ داغ کی غزل کے بارے میں

قدرت کے انداز نرالے ہیں۔ دکھ کا سکھ میں بدل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ مرزا داغ ابھی چھوٹے ہی سے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ بظاہر دکھ کا سامنا تھا لیکن جب ان کی ماں نے مرزا فخرو سے نکاح کر لیا تو داغ کے ننھے سے دل میں باپ کی شفقت کی محرومی کا احساس قدرے کم ہوگیا اور اس طرح دکھ کے بادل ان کے دل پر سے چھٹ گئے۔ داغ کی عمر اس وقت تیرہ سال کی ہو چکی تھی۔ ماں کے ساتھ اب وہ قلعہ معلیٰ میں رہنے لگے۔

اس وقت مغلیہ حکومت کا چراغ بس گل ہونے کو تھا۔ اقتدار تو چھن ہی چکا تھا۔ اب برائے نام بادشاہ تھے اور ان کی رنگ رلیاں۔ ساری فضا پر عیش و عشرت برس پڑی تھی۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے EPICURIANS کے تصورات کو حقیقی جامہ پہنایا جا رہا ہو۔ ایسی لکھنوی فضا میں داغ نے ایک دو دن نہیں، اپنی عمر کے بارہ سال گزار دیئے۔ شعر و شاعری کی محفلیں بھی سجتی تھیں۔ استاد ذوق کا طوطی بول رہا تھا۔ خود مرزا فخرو ان کے شاگرد تھے۔ غالب، مومن، شیفتہ اور آزردہ جیسے باکمال فن کاروں سے دلی کا ماحول شعر و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ داغ کی ذہنی و دماغی تربیت انہی فضاؤں میں ہوئی۔ ذوق کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے بعد ان کی شاعری میں نکھار آیا۔

ابھی زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ بساط الٹ گئی۔ داغ سے دلی چھوٹ گئی۔ وہ رام پور پہنچے۔ وہاں بھی عیش و نشاط کی محفلیں گرم تھیں۔ خود داغ کی ملازمت میں متعدد طوائفیں آئیں۔ رام پور ہی مخصوص نہیں، رام پور کے بعد حیدرآباد اور پھر دلی کے قیام میں بھی ان کا طوائفوں سے تعلق رہا جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ داغ کے یہاں وہ چھیڑ چھاڑ، وہ رمز و کنایے، وہ اشارے اور وہ گھاتیں اپنی اصل شکل میں ہیں جو اوروں کے یہاں اکثر روایتی ہیں۔

داغ مولانا حالی ہی کے ہم عصر تھے۔ آزاد و حالی کی نظم گوئی کی تحریک کا تو ان پر اثر نہ پڑا لیکن غزل کی دنیا میں انھوں نے جس حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا وہ جہاں ان کی شاعرانہ عظمت کا اظہار کرتی ہے وہیں اس کی بھی غماز ہے کہ ان پر آزاد و حالی کی حقیقت نگاری کی تحریک کا لاشعوری طور پر ہی سہی، اثر ضرور پڑا تھا۔ ان کی غزلوں میں ایک سچے عاشق کا دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ عاشق کے احساسات کی سچی تصویر نگاہوں کے سامنے ابھر کے آجاتی ہے۔

وعدۂ وفا کریں نہ کریں آئیں یا نہ آئیں گھبرا کے کچھ تو بول ہی جاتے ہیں صبح و شام

دلدار و دلفریب و دل آزار و دلستاں لاکھوں میں ہم کہیں گے کہ ہاں تم ہی تم ہو

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے تمہیں ہو شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

غزل کی قدیم روایت سے ذرا سا ہٹ کر انھوں نے عاشق کے کردار کو ایک انفرادی حیثیت دی۔ اس کا کردار کچھ بلند ہوتا نظر آیا تھا۔ یہ غزل کی دنیا میں اس وقت کے لحاظ سے ایک نئی بات تھی۔ عاشق کبھی محبوب سے ناراض ہوتا ہے اور بسا اوقات اسے آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ غم عشق سہتے سہتے وہ ابل پڑتا ہے اور اس طرح باتیں کرتا ہے جیسے اسے اس سے کوئی مطلب ہی نہیں:

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

میں کیا کروں بلا سے جو تو مہرباں ہے اب وہ دل کہاں ہے اب وہ طبیعت کہاں ہے اب

یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا او دغا باز فسوں ساز مکرنے والے

یہ بھی دشمن ہی کے حصے میں تھی اے تقدیر کام کیا اس کے تصور کا یہاں آنے سے

یہ صحیح ہے کہ داغ کے یہاں گہرائی نہیں۔ لیکن یہ سمجھنا کہ ان کے یہاں باتیں ہی باتیں ہیں، غلط ہے۔ جذبات کا جب چشمہ ابلتا ہے تو ایسی باتیں بھی نظر آتی ہیں جنھیں سن کر تہذیب آنکھیں بند کر لے۔ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کو اسی ضمن میں سمجھنا چاہیے۔ پھر داغ خود اس قسم کے حالات سے دوچار ہوئے تھے تو ان کا اظہار کیوں نہ کرتے۔ وہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے اظہار میں لذت پرستی کا احساس نہ ہو بلکہ پڑھنے والوں میں احساس جمال جاگے۔

گلشن میں ترے لبوں نے گویا رس چوس لیا کلی کلی کا

مانند برق، مثل ہوا، صورت نگاہ اکثر نکل گئے ہیں وہ میرے قریب سے

یہ ٹپکتا ہے تیری چتون سے کہ اشارے ہوئے ہیں دشمن سے

ساتھ شوخی کے کچھ حجاب بھی ہے اس ادا کا کہیں جواب بھی ہے

کیسا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات سب کچھ ہے اور کچھ نہیں تیری نگاہ میں

شرم آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لیے

رکھ دیا ہاتھ میرے منہ پہ بت کافر نے صبح اٹھتے نہ دیا نام خدا کا لے کر

میرے گھر خوف سے تھم تھم کے قدم رکھتے ہو کیا ہوا اب وہ کہاں شوخیِ رفتار گئی

زبان کی صفائی، محاوروں کا استعمال اور شاداب تشبیہ و استعارہ داغ کی خاص خصوصیات ہیں۔ ان کا لہجہ، ان کا تیور اور ان کا انداز کہیں دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ پروفیسر مسیح الزماں صاحب کا خیال ہے:

"...... لہجے کا اتار چڑھاؤ، فقروں کا موثر جملوں کے تیور داغ کے اشعا

(باقی صفحہ ۱۱ پہ کالم ۱)

معاصر

کیا آپ نے جواہر وانی "سنی"؟

خواجہ احمد عباس

آپ بھی ریڈیو سنتے ہیں۔ ہم بھی کبھی کبھی اپنے پڑوس کی مہربانی سے ریڈیو سن لیتے ہیں۔

کیوں صاحب، ریڈیو پر آپ نے پکا گانا سنا ہوگا، کچا گانا سنا ہوگا، دودھ بھارتی سے فلمی گانے سنے ہوں گے، بھجن سنے ہوں گے، قوالیاں سنی ہوں گی، دیہاتی پروگرام سنے ہوں گے۔ مگر کبھی آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کی آواز بھی سنی؟

۲۷ مئی کو پنڈت جی کی دوسری برسی منائی گئی کم سے کم اس دن تو امید کی جاتی تھی کہ تمام دن آل انڈیا ریڈیو سے پنڈت جواہر لال نہرو کی امر آواز سنائی جائے گی تاکہ ہندوستان کے عوام کو ایک بار پھر ان کے ترقی پسند خیالات کی گونج سنائی دے اور ان کو یہ محسوس ہو کہ ہمارا لال گلاب والا جواہر ہم سے جدا نہیں ہوا۔ آج بھی وہ اور اس کی آتما اور اس کی آواز ہمارے پاس ہے۔ "آکاش وانی" تو روز ہی سنتے ہیں۔ لیکن اس دن بھی آپ کو "جواہر وانی" سننے کو ملی؟

آج سے سات آٹھ برس پہلے انفارمیشن منسٹری کی فلم ڈویژن "ڈاکومنٹری بورڈ" نے ایک ڈاکومنٹری ردّ کر دی تھی کیونکہ اس میں جواہر لال نہرو کو یہ کہتے ہوئے دکھایا اور سنایا گیا تھا کہ بھاکرا ننگل جیسے بند جو عوام کی خوشحالی اور ترقی کے لیے بنائے گئے ہیں، اتنے ہی پوتر ہیں جیسے مندر اور مسجدیں۔ کہا گیا کہ ان الفاظ سے مذہب کی توہین ہوتی ہے۔ معاملہ اخباروں تک پہنچا تو ڈاکومنٹری کو پاس کیا گیا۔ لیکن یہ سب اس وقت ہوا جب پنڈت جواہر لال نہرو زندہ تھے۔ اس ملک کے پرائم منسٹر تھے۔ اس وقت بھی ایسے لوگ تھے جو ان کی آواز کو دبا دینا چاہتے تھے اور دبا سکتے تھے تو کیا آج ایسا نہیں ہو سکتا؟

مگر جواہر لال نہرو کی آواز سے یہ دشمنی کیوں ہے؟

کیا اس لیے کہ یہ آواز ہندوستان کی مکمل آزادی کا اعلان کرتی ہے؟

کیا اس لیے کہ یہ آواز ہندوستان کے عوام کو سوشلزم کا سبق پڑھاتی ہے؟

کیا اس لیے کہ یہ آواز سیکولرازم کا پرچار کرتی ہے؟ مذہب دھرم کے جھگڑوں سے سیاست کو الگ رکھنا سکھاتی ہے؟

کیا اس لیے کہ یہ آواز دنیا کی سب قوموں اور دنیا کے سب ملکوں سے دوستی کرنا سکھاتی ہے کسی بڑی طاقت کے سامنے سر جھکانا اور گھٹنے ٹیکنا نہیں سکھاتی؟

جو پنڈت جواہر لال نہرو کی آواز کے دشمن ہیں وہ ان کے خیالات اور نظریات کے بھی دشمن ہوں گے۔

لیکن ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی آواز آل انڈیا ریڈیو پر نہیں سنائی دیتی۔

وہ یہ ہے کہ پنڈت جی جو زبان بولتے تھے وہ زبان آل انڈیا ریڈیو پر نہیں بولی جاتی۔

خود پنڈت جی کی زندگی میں ان کی سیدھی سادھی ہندوستانی کی تقریریں براہ راست براڈکاسٹ نہیں کی جاتی تھیں۔ "شدھ ریڈیائی ہندی" میں ان کو ترجمہ سنایا جاتا تھا۔ ایک بار خود پنڈت جی نے مجھ سے فرمایا: "جبھی ریڈیو پروگرام سنتا ہوں تو میری اپنی تقریر بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کسی انجانی زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہے۔"

آج بھی اگر پنڈت جی کی تقریروں کے ریکارڈ سنائے جائیں تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ پنڈت جواہر لال جو ہندی یا ہندوستانی بولتے تھے اس میں اور ریڈیو کی بھاشا میں بڑا فرق ہے۔

آل انڈیا ریڈیو پر وہ زبان نہیں بولی جاتی جو مہاتما گاندھی بولتے تھے۔

آل انڈیا ریڈیو پر وہ زبان نہیں بولی جاتی جو پنڈت موتی لال اور پنڈت جواہر لال بولتے تھے۔

آل انڈیا ریڈیو پر وہ زبان نہیں بولی جاتی جو لال بہادر شاستری بولتے تھے۔ (جیسی زبان انھوں نے اس انٹرویو میں استعمال کی تھی جو ہندی اور اردو بلٹز میں پورا کا پورا شاستری جی کے الفاظ میں شائع کیا گیا تھا)

آج ہندوستان کی پرائم منسٹر اندرا گاندھی ہیں۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو پر وہ زبان نہیں بولی جاتی جو اندرا گاندھی بولتی ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو پر وہ زبان بولی جاتی ہے جو ہمارے ہندوستان میں کہیں نہیں بولی جاتی۔ نہ دلّی کے گلی کوچوں میں، نہ بنارس کے گھاٹ پر، نہ لکھنؤ کے حضرت گنج میں، نہ ناگپور میں، نہ بمبئی میں، صرف آل انڈیا ریڈیو پر بولی جاتی ہے۔

(اردو بلٹز)

غزلیں

حنیف تبسم

حیرتِ عشق سے تدبیر کہیں ہوتی ہے؟
راہبر پاؤں کی زنجیر کہیں ہوتی ہے؟

خامشی عینِ تکلم ہے نظر والوں کی
آئینہ سے کوئی تقریر کہیں ہوتی ہے؟

دل اسے شوق کا ہمیشہ بنا لیتا ہے
یاد اس کی جو عناں گیر کہیں ہوتی ہے

راہِ الفت میں خبر شرطِ سرافرازی ہے
بے خودی، مایۂ توقیر کہیں ہوتی ہے؟

چشمِ شاہد سے بدل جاتی ہے تصویرِ حیات
خواب ہوتی ہے یہ تعبیر کہیں ہوتی ہے

اشک بن کر کہیں آنکھوں سے ڈھلک جاتی ہے
زندگی جوشن و شمشیر کہیں ہوتی ہے

آزاد گلاٹی

جب ہمارے غم کے بھی آنکھوں سے آنچل چھن گئے
ذہن و دل احساسِ تنہائی سے بے کل ہو گئے

اس سے پہلے اک خلائے بیکراں تھی زندگی
تیرے غم سے اس کے سب پہلو مکمل ہو گئے

تیری یادوں نے ہمیں تسکین بھی دی بارہا
بارہا یوں بھی ہوا ہم ان سے بے کل ہو گئے

آشنا بے بس کیوں ہوا یارب جنونِ جستجو
سامنے منزل بھی تھی پائے جستجو شل ہو گئے

دل میں غم کی آگ، پانی آنکھ میں پھر بھی
ہم تمہارے عشق میں آوارہ بادل ہو گئے

ہم نے سوزِ عشق سے پائے رموزِ بے خودی
لوگ کہتے ہیں کہ اب آزاد پاگل ہو گئے

پرکاش فکری

گرچہ اپنا اسے بنایا تھا
پر نہ جانا کہ وہ پرایا تھا

پھر سے آنکھوں میں آ گئے آنسو
بعد مدت کے مسکرایا تھا

رات کل کی حسین تھی کتنی
ہر شجر نور میں نہایا تھا

اس کی باتیں نہ کر سکیں جادو
دل پہ غم کا دبیز سایا تھا

اب تناور درخت ہے دیکھو
بیج مٹی میں جو دبایا تھا

خواب خود ہی وہ بن گیا فکری
خواب جس نے مجھے دکھایا تھا

عتیق تابش

ہم نے سمندروں کی تہوں میں گزار دی
وہ زندگی کہ جس کی بناوٹ میں آگ تھی

اک جرم ہے حدوں سے زیادہ لحاظ بھی
ہم نے تمام عمر اکیلے گزار دی

پیشانیوں کو بند کواڑوں سے کوٹ لو
اہلِ جنوں پہ تنگ ہے الزامِ آگہی

سایہ بہ سایہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں تشنگی
انساں کی قدر نیک فرشتوں نے لوٹ لی

اس کو پکار اور پکار اور پکار اور
آتی نہیں ہے لوٹ کر آواز مر کبھی

ہر ہر مکاں سے شعلے نکلتے ہیں رات دن
ہر راہ سے گزرتی ہے بارات موت کی

میں کیا ہوں ایک تودۂ خاکِ شگوں زدہ
لازم نہیں ہے تجھ پہ مری سمت دیکھ بھی

بازآفرینیوں کی یہ قصۂ تمام ہے
یہ نسل آپ اپنی جوانی پہ مر مٹی

تجھ کو گلے لگایا تو یہ راز بھی کھلا
تیری رگوں میں میرے لہو کی بہار تھی

ہندوستان کی چودہ تسلیم شدہ زبانوں میں اردو کا درجہ چھٹا

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی صدارتی تقریر

حیدرآباد ۹ رجون ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے آندھرا پردیش سرکاری زبان بل میں اردو کے ساتھ حقیقی معنوں میں انصاف نہ کیے جانے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اس ایکٹ کی یہ دفعہ کہ مراعات ایک مقررہ مدت کے لیے ہوں گی اردو والوں کے بنیادی حقوق پر ضرب لگاتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں جب دارالہدیٰ میں منعقدہ اردو کانفرنس میں صدارتی تقریر فرما رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی چودہ مسلمہ زبانوں میں بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اردو کا نمبر چھٹا ہے۔ یہ کشمیری، ملیالم، اڑیا، آسامی، گجراتی، اور کنڑی سے بڑی زبان ہے جن کے علاقے موجود ہیں۔ یہ پنجابی سے بہت بڑی زبان ہے جس کا صوبہ بنے والا ہے۔ تاہم اس کے بولنے والوں کی تعداد کسی بھی ریاست میں پندرہ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ دو کروڑ ۳۰ لاکھ کی اردو بولنے والوں کی آبادی کشمیر، مدراس اور پنجاب تا بنگال اس طرح بکھری ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی علاقہ میں اس کی ریاست نہیں بنائی جا سکتی دراصل اردو کا مسئلہ ایک غیر علاقائی زبان کا مسئلہ ہے اور اس کا منصف بھی ہے یعنی یہ ایک بڑی کل ہند تہذیبی زبان کا مسئلہ ہے۔ اور اسے حل کرنے کے لیے اسی نقطۂ نظر پر توجہ دینی چاہیے۔ اردو کا ہر چند کہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر رواج ہے لیکن یہاں بھی یہ معاملہ سو فیصدی کا نہیں ہندوستان میں آباد چار پانچ کروڑ مسلمان میں لیکن ایسے باشندوں کی مجموعی تعداد جنھوں نے اپنی مادری زبان اردو لکھائی دو ڈیڑھ سو اور کروڑ ہے۔ ان ساڑھے دو کروڑ میں بھی ہزاروں غیر مسلم شامل ہیں دراصل اردو نہ کسی خاص فرقے کی زبان ہے اور نہ کسی خاص علاقہ کی۔ آندھرا پردیش میں اردو مادری زبان لکھوانے والوں کی تعداد پچیس لاکھ ہے۔ آندھرا پردیش کے مادری زبان اردو لکھوانے والوں کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان ۲۵ لاکھ کے علاوہ تقریباً پندرہ لاکھ کی آبادی ایسی ہے جو اسے اپنی مادری زبان قبول نہ کرنے کے باوجود ثانوی زبان کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے ریاست میں اردو کے بڑے پیمانے پر رواج کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو حالیہ "سرکاری زبان بل" میں نام لیکر جگہ دی ہے۔ جو لوگ راز درون خانہ سے آگاہ ہیں انھیں معلوم ہے کہ بل میں اردو کا نام شامل کرنے پر اس ریاست کے بالغ نظر چیف منسٹر کو کیا کچھ دیکھنا اور سننا نہیں پڑا۔ ان سے کہا گیا اردو ایک غیر ملکی تسلط کی یادگار ہے۔ یہ ظالموں اور غاصبوں کی زبان ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر حاصل ہے کہ ہمارے ملک کی بالغ نظر قیادت نے ان باتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تاہم حکومت نے زبان کے بارے میں جو بل منظور کیا ہے وہ ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہے اگرچہ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ آندھرا پردیش ہندوستان کی پہلی ریاست ہے جہاں اردو سے انصاف کرنے کی کوشش شروع کی گئی۔ اور سخت مخالفت کے باوجود اردو کا نام ریاست کے سرکاری زبان بل میں شامل کر دیا گیا۔ ہاں اس بات کی خلش ضرور ہے کہ بل میں بعض دفعات کی موجودگی کے باعث یہ رعایت اردو کے واجبی حق کے مطابق نہیں ملی۔ اس ایکٹ کی یہ دفعہ کہ یہ رعایت ایک مقررہ مدت کے لیے ہوگی، ہماری زبان اردو کے بنیادی حقوق پر ضرب لگاتی ہے۔ اردو کے مستقبل کے لیے کسی طرح ماہ و سال و میعاد کے تقرر کی قید و بند عائد کر کے اردو کے حقوق کو عارضی بنا دیا گیا ہے۔ جو ہماری تمناؤں کا خون کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس بل پر نظر ثانی کر کے اردو کے ساتھ واجبی انصاف کرنے کی ضرورت ہے۔ (راجیہ)

مراسلات

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

(رنبیر سنگھ جی (روزنامہ ملاپ) توجہ فرمائیں)

ہندوستان میں ایسے حضرات کی کمی نہیں جو کھاتے تو ہیں اردو کا لیکن جب اردو کے گن گانے کا وقت آئے تو منہ میں گھنگنیاں بھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان حضرات میں اردو کے مصنف، صحافی، اردو سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں وغیرہ میں اردو اساتذہ (لیکچرار، پروفیسرز یہاں تک کہ اردو شعبہ کے "کرسی نشین" بھی) پائے جاتے ہیں۔ اردو پر پلنے والوں کی اردو سے یہ بے اعتنائی بعض اوقات نہایت افسوسناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دعا ہے کہ خدا ایسے مصلحت پسندوں کو حق شناسی کی توفیق عطا کرے۔ آمین!

اسی قماش کے حضرات میں ہمارے ایک بزرگ ہیں، شری رنبیر سنگھ جی۔ آپ کا روزنامہ اخبار "ملاپ" ہندوستان کے تین مختلف مقامات یعنی دہلی، حیدرآباد اور جالندھر سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ ملک کے اردو اخبارات میں سب سے زیادہ تعداد میں چھپنے والا اخبار ہے۔ ہم کو اس دعوے پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ ہماری دعا ہے کہ یہ

"اللہ کرے زورِ اشاعت" اور زیادہ

معاصر ملاپ (اردو) کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ سرکار تو بارہا اس امر کا عملی اقرار کر چکی ہے۔ اس اعترافِ اہمیت کے طور پر مرحوم وزیر اعظم کے ساتھ تاشقند جانے والی اخبار نویسوں کی پارٹی میں شری رنبیر جی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ حکومت کو ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ چنانچہ شری رنبیر نے تاشقند سے واپس آ کر ایک طویل اور معلومات افزا مصور سلسلۂ مضامین "ملاپ" میں قسط وار شائع کیا۔ اسی سلسلۂ مضامین میں ایک ایسا مرحلہ آیا جس نے ہم کو پیش نظر سطور لکھنے پر مجبور کر دیا۔

"تاشقند کانفرنس سے متعلق اپنے سلسلۂ مضامین میں رنبیر صاحب نے ایک موقعہ پر اپنی اور پاکستانی اخبار "جنگ" کے مدیر اعلیٰ جناب میر خلیل الرحمٰن صاحب کی تحریروں کے عکس پہلو بہ پہلو شائع کیے۔ اپنی ان تحریروں میں ہر دو حضرات نے تاشقند کے سفر سے متعلق اپنے تاثرات مختصراً قلمبند کر کے روسی اخبارات میں شائع کرائے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مدیر جنگ کی تحریر تو اردو رسم الخط میں تھی۔ لیکن مدیر ملاپ نے اس موقعہ کے لیے ہندی رسم الخط منتخب کیا تھا جس کی کوئی تک ہماری سمجھ میں نہ آ سکی۔

ہم اپنی معلومات میں اضافہ کے لیے قبل ازیں تین مرتبہ محترم رنبیر جی کو خط لکھ کر زحمت دے چکے ہیں۔ کہ آخر وہ کونسی مصلحت تھی جس کے لیے ایک موقر اردو روزنامہ کے مدیر اعلیٰ نے غیر ملکیوں کے روبرو اپنے تاثرات رکھنے کے لیے اردو رسم الخط پر ہندی (دیوناگری) رسم الخط کو ترجیح دی؟ ہم ہندی کے مخالف نہیں، بلکہ اتنے ہی پرستار ہیں جتنا کوئی اور ہو سکتا ہے لیکن جس اخبار کے طفیل رنبیر جی کو تاشقند جانے والے صحافی طائفہ میں نمائندگی نصیب ہوئی تھی، وہ ہندی کا نہیں بلکہ اردو زبان کا اخبار ہے۔ لہٰذا اس موقعہ پر رنبیر جی کے اردو سے بے اعتنائی برتنے پر ہم کو ذہنی صدمہ پہنچا۔

ہمارے نزدیک محترم رنبیر جی کو تاشقند میں جرأت سے کام لیکر اپنے تاثرات اردو میں قلم بند کرنے چاہئیں تھے۔ جرأت کے فقدان کا جو ثبوت رنبیر جی نے اس موقعہ پر دیا تھا، ہمارے تین خطوط کے جواب میں خاموشی اختیار کر کے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ رنبیر جی جو خود کو بحر العلوم ثابت کرنے کے لیے ہر ہفتے اپنے اخبار میں انواع و اقسام کے سوالوں کا جواب دیتے رہتے ہیں ہمارے سیدھے سادے سوال پر اب تک خاموش ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ رنبیر جی اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ ہماری ان سے نیازمندانہ التماس ہے کہ وہ آئندہ اس کا اعادہ نہ فرمائیں۔

(سوم دت تنویر، چنڈی گڑھ)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حال ہی میں "نذرِ عرشی" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اکبر علی خاں صاحب کا ایک مضمون شامل ہے جس میں جناب عرشی کے علمی کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس مضمون میں اکبر صاحب نے "کہانی رانی کیتکی" اور "کنور اودے بھان کی" کے بارے میں یہ لکھا ہے:-

"یہ انشاء کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے مولانا عرشی نے کتب خانہ رضا رامپور کے دو قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس پر غلطی سے مرتب کی جگہ مولانا عبدالحق کا نام چھپ گیا ہے۔"

اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جیسے مولوی صاحب مرحوم نے دانستہ طور پر یہ کتاب اپنے نام سے شائع کی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کتاب پر مولوی صاحب کا نام بحیثیت مرتب درج نہیں ہے صرف اس مقدمے کے آخر میں نام ہے جو اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپا تھا۔ یہ درست ہے کہ عرشی صاحب قبلہ نے اس کتاب کے مطبوعہ ایڈیشن کو دو مخطوطات سے مقابلہ کرنے کے بعد مرتب کیا تھا اور یہ ضروری تھا کہ کتاب پر اس کی صراحت کی جاتی۔ اس کوتاہی کا سبب یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی انجمن سے مولوی صاحب مرحوم کا تعلق برائے نام تھا۔ وہ ہر اعتبار سے بے بس تھے۔ مولوی صاحب نے نئے ایڈیشن کے لیے ایک دیباچہ لکھا تھا جس میں عرشی صاحب کی محنت کا اعتراف کیا گیا تھا۔ انجمن کے سابقہ کارکنوں نے وہ دیباچہ کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد چھاپا۔ اس میں عرشی صاحب کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کا نام بھی خارج کر دیا اور اس حد تک عبارت کی کہ دیباچے میں سے رضا لائبریری رامپور کے الفاظ بھی نکال دیے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ارسال خدمت ہے۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ دیباچہ طبع ثانی"

کی عبارت نہ صرف بے ربط ہے بلکہ اس سے زیر نظر ایڈیشن کی خصوصیات کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ مولوی صاحب مرحوم کو اس کا بہت ملال تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آئندہ ایڈیشن میں عرشی صاحب کا نام دیا جائے گا اور ان کی محنت کا پوری طرح اعتراف کیا جائے گا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ کتاب کے تیسرے ایڈیشن کی نوبت ہی نہ آئی لیکن جب بھی اس کا موقع ہوگا مولوی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔ عرشی صاحب کا مسودہ انجمن کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے۔ امید ہے ان سطور کی اشاعت کے بعد کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان باقی نہیں رہے گا۔

(مشفق خواجہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی)

یہ شعر کس کا ہے

"ہماری زبان" کے ذریعہ یہ بتانے کی تکلیف گوارا فرمائیں کہ یہ شعر:

"تا قیامت شب فرقت میں گزر جائے گی عمر
سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہونے تک"

کس کا ہے۔ (زینت جہاں)

"م" کے استفسار پر

"ہماری زبان" کے ۱۵ مئی کے شمارے میں جن اشعار سے متعلق استفسار کیا گیا تھا، ان میں سے بیشتر سے متعلق اطلاع یکم جون کے شمارے میں چھپ گئی ہے۔ ایک اور شعر سے متعلق ذیل میں لکھ رہا ہوں۔ بقیہ چھ شعروں سے متعلق ہنوز توجہ کی ضرورت ہے۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا

یہ شعر ذوق کا ہے (دیکھئے دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد: ۲۳) البتہ مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی میں "پایا" کی جگہ "دیکھا" ہے۔

(مالک رام)

حسنِ مطلع (یا زیبِ مطلع)

حسنِ مطلع کے سلسلہ میں متضاد خیالات ملتے ہیں:۔

علامہ اخلاق دہلوی "فن شاعری" (صفحہ ۴۳ طبع سوم) میں لکھتے ہیں "جس شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اُسے مطلع کہتے ہیں۔ غزل اور قصیدے کا پہلا شعر عام طور سے مطلع ہی ہوتا ہے۔ مطلع کئی بھی ہو سکتے ہیں اور انھیں حسنِ مطلع کہتے ہیں۔"

مرزا محمد عسکری صاحب نے "آئینہ بلاغت" (صفحہ ۹ پہلا ایڈیشن) میں تحریر کیا ہے۔

"حسنِ مطلع (یا زیبِ مطلع) غزل میں مطلع کے بعد دوسرا مطلع،

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیداد کاوش ہائے پنہاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا (غالب)

پہلا شعر مطلع دوسرا حسنِ مطلع"

مگر محترمی ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب "اردو غزل کی نشو و نما" کے صفحہ ۴۴ پر رقمطراز ہیں:۔

"مطلع کے بعد کا شعر اگر مطلع ہے تو اسے مطلع ثانی کہتے ہیں لیکن اگر مطلع نہیں ہے تو اسے حسنِ مطلع"

مطلع کے بعد کا دوسرا شعر اگر مطلع ہے تو اسے مطلع ثانی نہ کہہ کے حسنِ مطلع کہہ دینے میں کیا حرج ہے جب کہ بیشتر قصیدوں میں چند اشعار کے بعد اگر شاعر دوبارہ مطلع کہہ کے کوئی خیال یا بات از سر نو پیش کرتا ہے تو وہ مطلع ثانی یا مطلع دوم کہلاتا ہے، اسی طرح کچھ شعر کے بعد مطلع سوم و چہارم وغیرہ وغیرہ۔ غزل میں تو دو غزلہ، سہ غزلہ و چہار غزلہ وغیرہ کا سلسلہ ہے پابندی اشعار سے قطع نظر، کیوں نہ انھیں بھی مطلع دوم، سوم و چہارم وغیرہ کہا جائے۔

ان متضاد خیالات کی بنا پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں کون نقطۂ نظر درست مانا جائے۔ اہلِ نظر حضرات سے مسئلے پر روشنی ڈالنے کی گزارش ہے۔

(سید مجاہد حسین رضوی)

گزارش

جناب عبد الخالق سعید صاحب حیدر آبادی کی لکھی ہوئی کتاب "میسور میں اردو" میں سے مجھے حضرت انجم رح اور حضرت شاہ ابو الحسن ادیب صاحب کے حالات درکار ہیں۔ اگر کوئی صاحب "ہماری زبان" ہی سے یا مجھے خود مطلع فرما دیں تو میں بہت ہی ممنون ہوں گا۔ اگر کوئی صاحب کتاب ہی بھیجنا چاہتے ہیں تو میں اس کا معاوضہ بھی ادا کر دوں گا۔ جناب عبد الخالق سعید صاحب بقید حیات ہیں یا نہیں اگر ہیں تو ان کے پتہ سے بھی آگاہ کر دیں۔

ایس انجم الحسن انجم ادیب
انجم منزل۔ کٹھاریالیہ
کولار
(ریاست میسور)

اردو کو بہار کی علاقائی زبان قرار دیا جائے

شمالی بہار اردو کانفرنس کا مطالبہ

پٹنہ ۱۰ جون۔ شمالی بہار اردو کانفرنس کا تاریخی اجلاس ۴ جون کو بہار کے مشہور اور تاریخی شہر سیوان میں منعقد ہوا۔ ۷ بجے شام کو پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ جناب شاہ احمد خاں ایڈووکیٹ صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے جناب پنڈت سندر لال کی خدمات زبان و قوم کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے موصوف کا اسم گرامی صدارت کے لیے تجویز فرمایا۔ جناب بیتاب صدیقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار نے اس تجویز کی تائید فرمائی۔

سب سے پہلے سورج نرائن سنگھ صدر مجلس استقبالیہ کی طرف سے شمشاد علی خاں یعقوبی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو سیوان نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ اس کے بعد جناب این۔ ایم۔ احمد غنی سکریٹری مجلس استقبالیہ شمالی بہار اردو کانفرنس نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ بعدہٗ پنڈت سندر لال نے اپنے عالمانہ خطبۂ صدارت سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

جناب پنڈت سندر لال کے بعد سید بدر الدجیٰ ایم پی نے جلسہ سے خطاب فرمایا۔

دوسرے دن ۵ جون کو ۸ بجے صبح میں پنڈال کے اندر ڈیلی گیٹ سیشن کا اجلاس ہوا۔

اس جلسے میں چند اہم تجاویز پاس کی گئیں۔

ساڑھے پانچ بجے شام میں جلسہ پھر شروع ہوا۔ سب سے پہلے وہ تجاویز پیش کی گئیں جو مجلس مضامین نے منظور کی تھیں۔ ان تجاویز پر مختلف مقتدر ارباب فکر نے اپنے احساسات و جذبات ظاہر کرتے ہوئے تائیدی تقریریں کیں۔

این۔ ایم۔ احمد غنی اور جناب بیتاب صدیقی نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ بعدہٗ مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جناب غضنفر نواب دانش عظیم آبادی نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔ مشاعرہ میں محمد عثمان الشر، ندیم مجاز نوری، معصوم شرفی، اسیر، جذب گوپال گنجوی، رضا سمروی، احسان محمد آبادی، شکیب ایاز اور غضنفر نواب دانش عظیم آبادی نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

شرکائے جلسہ میں مندرجہ ذیل اصحاب فکر و دانش کے نام قابل ذکر ہیں۔

جناب سید نظیر حیدر ایم۔ ایل۔ سی، جناب سید مظہر امام ایم۔ پی، جناب شاہ مشتاق احمد ایم۔ ایل۔ اے، جناب عتیق انصاری، جناب شمس الہدیٰ استھانوی، جناب ضیاء الرحمٰن غوثی، جناب یعقوب یونس، جناب سہیل ظفر، جناب قاضی متین احمد ایم۔ پی (سابق)، جناب شہاب احمد ہاشمی، جناب پروفیسر سہراب، جناب معین الدین خاں ایڈووکیٹ، جناب حاجی وراثت حسین صاحب وغیرہم۔

اس کانفرنس میں جو تجاویز پاس کی گئیں وہ درج ذیل ہیں۔

تجویز ۱

آزاد ہندوستان میں زبان اردو کی حق تلفیوں کا مسئلہ اب اتنا پرانا اور مشہور ہو چکا ہے کہ اس کی مزید وضاحت بھی تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک آزادی کے انیس برسوں میں حکومت ہند اور حکومت بہار نے نہ صرف یہ کہ اردو کے ساتھ مکمل بے اعتنائی برتی ہے بلکہ اردو کشی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ بہرحال اہل اردو انجمن ترقی اردو ہند اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر قیادت پیہم اردو کے حقوق کی بازیافت کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ انھوں نے یو۔ پی اور بہار سے ۲۲ لاکھ دستخط فراہم کرکے باضابطہ ایک وفد کی صورت میں صدر جمہوریہ کی خدمت میں عرضداشت پیش کی۔ اس کے علاوہ متعدد مواقع پر جلسوں، تجویزوں، وفدوں اور یادداشتوں کے ذریعے بار بار حکومت کو اردو کے حقوق کی پامالی کی طرف توجہ دلاتے اور اس سے مطالبہ کرتے رہے کہ جمہوری و آئینی طور پر ملک میں اردو کو اس کا جائز مقام دے اور اس کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری وسائل مہیا کرے لیکن حکومت نے اس ملک سے اردو کو ختم کرنے کا جو عزم کر رکھا ہے وہ اس پر اب تک قائم اور عمل پیرا ہے۔

ان حالات میں شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ اجلاس صدر جمہوریہ، حکومت ہند اور حکومت بہار سے شدید ترین مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فوراً اردو کے سلسلے میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے اس قدیمی مطالبے کو تسلیم کرنے کا اعلان کرے کہ اردو دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت بہار کی علاقائی زبان قرار دی جائے تاکہ اس ریاست میں اردو کو تعلیمی اور انتظامی کیا جا سکے۔ اور اس مقصد کے لیے حکومت باضابطہ بہار اسٹیٹ آفیشیل لنگویج ایکٹ میں ترمیم کرکے اردو کی پوزیشن کو قانونی طور پر مستحکم کردے۔

یہ شاید حکومت ہند اور حکومت بہار سے ہمارا آخری مطالبہ ہو۔ اس لیے کہ حکومت اگر اب بھی انصاف پر آمادہ نہیں ہوئی اور حسب سابق اس نے ہمارے مطالبے کو ٹال دیا تو ہم حکومت کو جتا دینا چاہتے ہیں کہ اب اہل اردو کے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو چکا ہے، وہ اپنے مطالبے کی تکمیل میں اب کسی قسم کی ذرا بھی تاخیر گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں، اب وہ اپنے مطالبے کی عدم تکمیل کی صورت میں راست اقدام کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ کے مشترک جلسے منعقدہ ۱۰ اپریل ۶۶ء نے اس سلسلے میں ایک واضح اور قطعی تجویز منظور کرلی ہے اور اس تجویز کے نتیجے میں قائم شدہ ایکشن کمیٹی نے عمل کا ایک پروگرام بھی بنا لیا ہے۔

لہٰذا شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ اجلاس بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے تجویز کیے ہوئے اقدامات کی پوری پوری تائید کرتے ہوئے بہار کے اردو عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ ہر قسم کی تکلیفوں اور قربانیوں کے لیے پوری طرح تیار کرلیں اور اپنی مادری زبان کے حقوق منوانے کی راہ میں اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہو جائیں۔

محرک :۔جناب مولانا بیتاب صدیقی جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو۔
مؤیدین :۔جناب مغل میاں کانسلر، جناب شمس الہدیٰ استھانوی، جناب یعقوب یونس سکریٹری بہار اسٹیٹ مسلم مجلس مشاورت، جناب قاضی عبدالمتین سابق ایم۔ پی (سوتنتر پارٹی)، ڈاکٹر منصور حسن اعجازی، جناب عبدالجلیل صاحب (کمیونسٹ)، جناب غضنفر نواب دانش، شری ہر شنکر پرشاد، جناب معین الدین ایڈوکیٹ۔

تجویز نمبر ۲ :۔

شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت کے اس تساہل کی شدید مذمت کرتا ہے کہ نومبر ۶۵ء کے مڈل امتحان میں غیر لسانی پرچوں کے سوالات اردو میں نہیں دیے گئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے حکومت سے احتجاج کیا، جس کے نتیجہ میں محکمۂ تعلیم نے اس کوتاہی کی تلافی کرنے کا وعدہ کیا، لیکن اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ فی الواقع محکمۂ تعلیم نے اس سلسلے میں کیا کچھ کیا، اب تک نہ تو پچھلی غلطی کی تلافی کے وعدوں کو وفا کیا گیا ہے اور نہ آئندہ کے لیے کسی ضمانت کی باضابطہ اطلاع دی گئی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت بہار کے محکمۂ تعلیم کی یہ روش بھی ناقابل فہم اور سخت اندیشہ ناک ہے کہ اصولی طور پر ابتدائی تعلیم میں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان تسلیم کرنے کے بعد اب عملاً اردو کے ذریعے تعلیم و امتحان کی سہولتیں ختم کر دی گئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اب اردو کو ایک لازمی مضمون کی فہرست سے نکال کر اختیاری زبانوں کی فہرست میں ڈال دیا ہے، حالاں کہ یہ بات حکومت کے تسلیم شدہ ضابطۂ ابتدائی تعلیم کے بھی بالکل خلاف ہے۔

لہٰذا شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت ہند سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فوراً اپنے محکمۂ تعلیم کی مذکورہ غلطیوں کے ازالے کا سامان کرے، اردو کو حسب سابق ابتدائی تعلیم کے درجوں میں ایک لازمی مضمون قرار دے اور حسب سابق ہی اُسے ذریعۂ تعلیم اور ذریعہ امتحان بنا دے۔

ساتھ ہی یہ اجلاس حکومت کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کراتا ہے کہ مڈل امتحان کے نصاب سے فارسی کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے، حالاں کہ فارسی اردو کے لیے ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے لہٰذا بے حد ضروری ہے کہ اردو کی صحیح تعلیم کے لیے سنسکرت کی طرح فارسی کی لازمی حیثیت کو برقرار کیا جائے۔

محرک :۔ بیتاب صدیقی جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو۔
مؤیدین :۔جناب مغل میاں کانسلر پٹنہ کارپوریشن، جناب شمس الہدیٰ استھانوی مدیر "بہار نعرہ"

تجویز نمبر ۳ :۔

شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت بہار کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہے کہ سارن ضلع اردو سبھا کی کانفرنس منعقدہ ۲۷ مارچ ۶۶ء کی تجویز کے جواب تک کھمی رام ہائی اسکول تھاوے اور بسرا اردو مڈل اسکول میں اردو کی تعلیم اور اردو کے معلموں کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا ازالہ نہیں کیا گیا ہے۔ کھمی رام ہائی اسکول تھاوے سے اردو کے معلموں کو بغیر کسی معقول وجہ کے برطرف کر دیا گیا ہے۔ بسرا مڈل اسکول میں اردو داں ہیڈ ماسٹر کے ریٹائر ہونے کے بعد اب صرف ایک اردو معلم رہ گیا ہے۔ حالاں کہ یہ اسکول ۱۹۲۵ء سے اردو بیسس اسکول چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس حکومت بہار کے محکمۂ تعلیم سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فوراً اس سلسلے میں سارن ضلع اردو سبھا کی کانفرنس کے تجویز کیے ہوئے مطالبوں کو پورا کرے۔

محرک :۔ شمشاد علی خاں لعقیلی سیوان سکریٹری انجمن ترقی اردو سیوان
مؤیدین :۔ صالح حسین مختار گوپال گنج، جناب غنی احمد صاحب سیوان

تجویز نمبر ۴ :۔

شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ جلسہ بہار یونیورسٹی سے بجا طور پر اردو طلبا یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان کالج حاجی پور کے شعبۂ اردو میں گریجویشن اردو کے علاوہ بہ فیصل اردو کی تعلیم کے سلسلے کو منظور کر کے ایک دیرینہ کمی کو پورا کرے۔

محرک :۔ ظہیر عالم ایڈوکیٹ حاجی پور۔
مؤیدین :۔ محمود الرحمٰن حاجی پور، ضیاء الرحمٰن غوثی مدیر قومی تنظیم دربھنگہ

تجویز نمبر ۵ :۔

شمالی بہار اردو کانفرنس کا یہ اجلاس آل انڈیا ریڈیو سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ جو خبریں اردو میں دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، حیدرآباد اور جموں کشمیر سے نشر کی جاتی ہیں وہ پٹنہ، رانچی ریڈیو سے بھی ریلے کی جائیں۔

محرک :۔ سید مظفر حسین مصطفیٰ باغ
مؤیدین :۔ غلام علی رضوی سبکین پور، جناب معین انصاری

(محمد عثمان اشرف ندیم، آفس سکریٹری
بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، پٹنہ)

اُردو ہال کو ایک تاریخی کرسی کا عطیہ

حال ہی میں پروفیسر ہادی حسن کی ۹۳ سالہ والدہ بیگم حسین صاحبہ نے جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) کو ان کی گراں قدر خدمتوں کے مدنظر جو مکتوب تحریر کر کے روانہ کیا ہے اس کا اقتباس شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ "ہماری زبان")

آپ کی خدمتوں کے اعتراف میں بطور تحفہ ایک خاصی خوبصورت کرسی اردو ہال کو دے رہی ہوں جو امید ہے کہ صدارتی کرسی کے طور پر استعمال کے لیے موزوں تصور کی جائے گی خاص کر اس لیے کہ جب کبھی ہمارے گھر جلسے اور ادبی محفلیں ہوتی تھیں یا میرے بیٹے بدرالحسن مرحوم کے اہتمام میں وقتاً فوقتاً ریڈی ہاسٹل یا اعداد باہمی کے ہال میں لکچر ہوتے تھے، یہ کرسی ہمیشہ صدارت کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس طرح مختلف اوقات اور موقعوں پر مسز سروجنی دیوی، علامہ علی حیدر طباطبائی

مہاراجہ کشن پرشاد، حبیب الرحمن شروانی، حبیب بیگم (والدۂ نواب علی یاور جنگ) نواب عماد الملک، علی براداران، علی نواز جنگ، سر اکبر حیدری، سر سلطان احمد علامہ سلیمان ندوی، عابدہ، ظہیر، دو لھا صاحب عروج (نبیرۂ انیس)، فانی بدایونی، فرحت اللہ بیگ، غلام یزدانی، بابائے اردو مولوی عبد الحق جیسے بزرگ، عالم، ادیب، شاعر یا سلطنت ساز وغیرہ سے لے کر مختلف علوم و فنون میں شہرت رکھنے والی یا کم معروف مگر مستحق شہرت ہستیاں (جن میں بہت سی بحمد اللہ ہم میں موجود ہیں) اس کرسی کو زینت بخش چکی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کرسی صرف کسی تمدنی ادارہ کو دی جانے کی مستحق ہوسکتی تھی۔"

(فخر الحاجیہ مسز امیر حسن)

شاخ گوالیار کی مجلس عاملہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو گوالیار کی مجلس عاملہ کا جلسہ مورخہ ۸ مئی کو جناب موتی لال شرما ایڈوکیٹ کی صدارت میں جناب پریم چند کشیپ ایم اے کے مکان پر منعقد ہوا۔ جلسے میں تجاویز متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ ایک تجویز کے ذریعے اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا کہ دو سال پیشتر گوالیار میں جیواجی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے، تب سے انجمن ترقی اردو اور بزم اردو کی مسلسل کوششوں اور گوالیار کے اردو دوستوں کے مطالبہ کے باوجود ابھی تک یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا۔ مجلس عاملہ نے جنرل سکریٹری کو مجاز قرار دیا کہ وہ ایک یادداشت مرتب کرکے نائب صدر جناب پریم چند کشیپ ایم اے کو دیں تاکہ وہ اپنے بھوپال کے دوران قیام میں وزیر تعلیم کو پیش کر سکیں۔ اس عرضداشت میں ایم ایل بی آرٹس اینڈ کامرس کالج اور کملا راجہ گرلس کالج میں جولائی ۱۹۶۶ء سے اردو کلاسز شروع کرنے کے مطالبہ کو ایک بار پھر دوہرایا جائے۔

دوسری تجویز کے ذریعے مرکزی محکمۂ اطلاعات و نشریات کے اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہوئے جس کے ذریعے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ڈیڑھ گھنٹے روزانہ اردو کا خاص پروگرام نشر ہونا شروع ہوا ہے اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا کہ اب تک بھوپال ریڈیو اسٹیشن سے اردو کا کوئی پروگرام "اردو پروگرام" کے نام سے نہیں ہوتا حالانکہ انجمن کی گوالیار شاخ بہت پہلے یہ مطالبہ کر چکی ہے۔ انجمن کے جنرل سکریٹری کو مجاز قرار دیا گیا کہ وہ ایک یادداشت اس سلسلے میں تیار کرکے محکمۂ اطلاعات و نشریات کے اعلیٰ حکام کو روانہ کریں۔

آخر میں انجمن کے سابق صدر جناب منصور علی شاہ صاحب کی وفات پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

(وقار صدیقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو گوالیار)

کھام گاؤں میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہوگئی

مہاراشٹر کے اردو دوستوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کھام گاؤں میں بھی قائم کردی گئی۔ کھام گاؤں کے اردو دوستوں سے درخواست ہے کہ اردو کے مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کھام گاؤں کے ممبر بنیں۔

رکن سازی کے فارم حاصل کرنے کا پتہ:۔

سکریٹری صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کھام گاؤں، کھام گاؤں ٹاؤن ڈسٹرکٹ بلڈانہ

م۔ ی کھتری شعبۂ نشر و اشاعت انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر

محبان اردو ورنگل کا ایک جلسہ

ورنگل۔ ۲۰ جون ۶۶ء جمعیۃ العلماء ضلع ورنگل کے زیر اہتمام محبان اردو کا ایک جلسہ عثمان پورہ میں پرنسپل شورلی کالج جناب سید صاحب حسینی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسہ کو معتمد عمومی جمعیۃ العلماء آندھرا پردیش جناب عبد السبحان صاحب نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے بارے میں آندھرا پردیش کے چیف منسٹروں نے کیے بعد دیگرے جو یقین دہانیاں دی تھیں وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا ہے۔ جب تک اس کی تکمیل نہ ہو اور اردو کو کم از کم ثانوی مرتبہ حاصل نہ ہو ہماری جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔ بعد ازیں جناب عبد الرزاق صاحب وکیل کی تحریک اور جناب خواجہ معین الدین الیاس کی تائید سے ایک قرارداد منظور کی گئی جسے بطور یادداشت چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(محمد عبد القادر کنو میاں)

چندرپور ضلع پریشد کی اردو دشمن پالیسی پر فیض انصاری کی تنقید

جناب فیض انصاری سکریٹری انجمن ترقی اردو علاقہ ودربھ (مہاراشٹر) نے ایک اخباری بیان میں چندرپور ضلع پریشد کی اردو دشمن پالیسی پر سخت تنقید کی ہے۔ انصاری صاحب نے اپنا بیان ضلع چندرپور کا دورہ کرنے کے بعد دیا۔ انھوں نے ارباب حل و عقد کی توجہ ان دشواریوں کی طرف دلائی ہے جو اردو پڑھنے والے طلبہ کو تعلیمی اداروں میں پیش آرہی ہیں اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان دشواریوں کا فوری تدارک کرے۔

(ایک نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کی افغانستان روانگی

علی گڑھ، ۱۹ر جون۔ مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کی قیادت میں ہندوستان کا ایک وفد آج نئی دہلی سے کابل کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وفد کابل میں منعقد ہونے والے ہفت روزہ سیمینار میں شرکت کرے گا۔ اس سیمینار میں ترجمہ کے مسائل پر مقالے پڑھے جائیں گے اور تبادلۂ خیال کیا جائے گا۔ اس وفد کے دوسرے رکن مشہور محقق جناب مالک رام صاحب ہیں۔ اس سیمینار میں ہندوستان، امریکہ، روس، ایران، افغانستان اور پاکستان کے دانشور شریک ہوں گے۔

(نامہ نگار)

"ہماری زبان" کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

صفحہ ۳ سے آگے

میں ایسی انفرادیت پیدا کرتے ہیں کہ معنویت کہیں کی کہیں پہونچ جاتی ہے۔ ان سے ان کے اندازِ بیان کا حسن اور نکھر اٹھتا ہے اور دہک اٹھتا ہے۔

تیرے قربان کوئی دم یہی تکرار رہے دل ہمارا ہے ہمارا ہے تمہارا کیسا

ہم حقیقت میں سمجھتے ہیں اسے تکیہ کلام آپ دل لیکے کہے جاتے ہیں کیا کیا

وہ عیادت کو مری آئے ہیں لو اور سنو آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

اے کاش میرے تیرے لیے کل یہ حکم ہو لے جاؤ ان کو خلد میں جو کچھ ہوا ہوا

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو وہ طریقہ تو بتا دو تمہیں چاہیں کیوں کر

شاعر ارباب نشاط کہہ کر داغ کا مذاق اڑانے والے ان اشعار کو دیکھیں جو زبان زد ہو چکے ہیں اور جن کی حیثیت ضرب المثل سی ہو کر رہ گئی ہے:

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

چھلک رہی چشم جگر بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

یہ دل ہے، یہ حسرت، یہ ارمان ہے میری جان حاضر میں حجت نہیں

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

لیجیے سنیے اب افسانۂ فرقت مجھ سے آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

زبان کو پاک صاف کرنے میں ناسخ کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے جہاں تک داغ کا تعلق ہے انھوں نے بھی زبان کو تیر بہ نشست اور رواں بنانے میں اپنی تمام عمر صرف کر دی اور زبان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دوسری زبانوں سے آنکھ ملا سکے۔ انھوں نے نہ صرف خود بلکہ اپنے لاتعداد شاگردوں کے ذریعہ اپنے مشن کو کامیاب بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جیوں ہی اردو کی شیرینی کا احساس ہوا اور فوراً یہ شعر زبان پر آ گیا۔

داغ ہی کے دم سے تھا لطف سخن
شعر گوئی کا مزا جاتا رہا

صفحہ ۲ سے آگے

معیار کو بدلنا ہوگا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے معیار یکسر بدل جائیں گے۔ ہاں ان میں خاصی لچک ہوگی۔ ہمیں فارسی ترکیب کی بیساکھی کا اتنا سہارا لینے کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ یہ بیساکھیاں ایک حد تک اپنے پیروں میں طاقت کی کمی کا بھی ثبوت ہیں۔ ہمیں بحروں، قافیے، ردیف، مروجہ اصنافِ سخن کی شکستہ بندی وغیرہ سے بھی خاصا آزاد ہونا پڑے گا۔ ہمیں نظم کو اس قابل بنانا پڑے گا کہ وہ ایک طرف دھرتی پر ہل چلاتے ہوئے کسان کے ذہن کی ترجمانی کر سکے اور دوسری طرف آن خلا کے سیاحوں کے ذہن کی عکاسی بھی، جو زمین کی کشش کو کشش ثقل سے آزاد ہو کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لیے ہمارا موجودہ علم اور زبان کا محدود سرمایہ کافی نہ ہوگا بلکہ بول چال کی زبان کی بنیاد کے ساتھ جدید علمی زبان سے بھی کہیں کہیں مدد لینی پڑے گی، خصوصاً ہندی بحروں کی آزادی اور موسیقی کے علم دونوں سے اور زیادہ فائدہ اٹھانا پڑے گا۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید نظم اگر جدید ذہن کی عکاسی کرنے لگی، تو یہ اور بھی مشکل ہو جائے گی، وہ غلطی پر ہیں۔ یہ مشکل سہل پسند ذہنوں کے لیے ہے، اس ذہن کے لیے نہیں جو ایک طرف اپنے تہذیبی سرمایے سے واقف ہے، دوسری طرف جدید علمی دنیا کے کارناموں سے بھی۔ جدید شاعری مشکل اور مخصوص ہوتی ہے تو وہ ایک محدود طبقے کی ذہنی تفریح یا اس کی الجھنوں اور نفسیاتی گرہوں کی طلسم بندی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب شاعر سماج سے گھبرا کر اس کا حلقہ توڑ دیتا ہے اور اپنی ذات کو کائنات سمجھنے لگتا ہے۔ اردو شاعری کو نئے سرے سے کائنات کے اس حلقے میں داخل ہونا ہے جس میں سات میل گہرا سمندر اور لاکھوں کروڑوں میل دور ستارے شامل ہیں اور جس میں انسان آج پاکیزگی اور نجاتِ ابدی کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اسے زبان سے ایک نیا عشق پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اس کی ہر ادا کو سمجھ سکے! اسے اپنی سرزمین پر اپنی جگہ بنانی ہے اور اسی اپنی سرزمین کے ہر رنگ و آہنگ سے گونجنا ہے۔ اسے قدما کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے، اسے میر کے ذہن کی تقلید نہیں کرنا ہے، بلکہ میر کو بھی جذب کرنا ہے۔ اسے سیاست، مذہب، جنس کی تہہ تک پہنچنا ہے اور انسانیت پر وہ اعتقاد اور اپنے مشن پر وہ اعتماد پیدا کرنا ہے جو نشہ بھی ہے نجات بھی۔ غالب اور اقبال سے ہم بہت کچھ لے چکے۔ میر، نظیر، سودا سے ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں اور ہندی شاعری کے اس حصے سے بھی جس کے اسرار میں ہماری تہذیب اور تاریخ کے کتنے ہی جگمگاتے مرقعے پوشیدہ ہیں۔ اس ضرورت کا احساس تو ہے، مگر یہ ابھی عام نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں اپنے اپنے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر اب میدان میں نکلنا چاہیے۔ کتنی ہی جگہ کچھ چراغ بجھ جاتے ہیں، مگر کچھ اور نئے جلتے بھی ہیں۔ ہماری زبان اتنی جاندار ہے کہ وہ اب تک جس طرح تہذیب رندی کی ترجمانی کرتی رہی ہے، اسی طرح تہذیب کے ہر رقص کی بھی ترجمانی کر سکے گی۔ اس رقص کی طرف میلان شروع ہو گیا ہے۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اور آگے بڑھائیں حتیٰ کہ یہ ہمارا نمائندہ انداز بن جائے۔ (تمام شد)

تبصرے

شہریار

گلِ تازہ۔ مجموعۂ کلام صلاح الدین نیر

قیمت: ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: ۲۱،۶،۲۳۸، گونڈکی باؤلی حیدرآباد (آندھرا)

صلاح الدین نیر حیدرآباد کے نوجوان شاعر ہیں۔ "موجِ گل" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں ان کی پانچ سال کی منتخب غزلیں شامل ہیں۔ "سرگزشتِ دل" کے عنوان سے نیر صاحب نے جو دیباچہ رقم کیا ہے اس سے ان کے جذباتی اور ذہنی ارتقاء کا بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ شاعری بلکہ غزل گوئی ان کے لیے کسی چیز کو چھپانے کا ذریعہ بھی ہے اور کسی چیز کو ظاہر کرنے کا وسیلہ بھی۔ خود کو چھپانے اور ظاہر کرنے کی یہ کشمکش ان کے انتساب تک میں موجود ہے جہاں کسی کے نام کے بجائے ایک بڑا سا سوالیہ نشان ابھرا ہوا ہے۔ اس سوالیہ نشان کی علامتی اہمیت کی طرف نیر صاحب نے سرگزشتِ دل میں اشارہ بھی کیا ہے۔

غزل کی صنف اپنے مخصوص لفظی سرمائے اور ہیئتی سخت گیری کی وجہ سے شاعر اپنی انفرادیت کو پوری طرح ظاہر کرنے نہیں دیتی یہی وجہ ہے کہ آج کا شاعر غزل کے مقابلے میں نظم کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ اسے کائنات بھی اسی لیے حسین لگتی ہے اور عزیز معلوم ہوتی ہے کہ اس کا تعلق اس کی ذات سے ہے یعنی وہ اپنی ذات کے حوالے سے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نیر صاحب کی شاعری کا موضوع چونکہ وہ مجرد احساسات اور جذبات ہیں جن کا تعلق عشق اور عشقیہ کیفیات سے ہے، اس لیے غزل ان کے لیے مناسب ذریعہ اظہار ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اچھے شعر ملاحظہ کیجیے:

تمام مرحلۂ شوق طے کیے دل نے وہ اک نگاہ مگر آج بھی سوالی ہے

تم خود بھی محبت کی فضاؤں میں ہو تنہا
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہم بھی ہیں اکیلے

مجھ کو تمہارے نام سے ہر غم قبول ہے
میرے شکستہ دل کا ہر اک زخم پھول ہے

یہ ان کی گلی ہے بادِ صبا آہستہ گزر آہستہ گزر
یہ راہ وفا ہے راہ وفا آہستہ گزر آہستہ گزر

"موجِ گل" میں ایسے خوب صورت اشعار آپ کو جا بجا ملیں گے۔

پہلا وہ گھر خدا کا۔ غلام سرور (سفرنامہ)

قیمت: ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ بانو معرفت اصغر انشاء غلام سرور، صدر بازار داناپور کینٹ ضلع پٹنہ

بہار میں اردو کی تحریک چلانے والوں میں غلام سرور صاحب کا نام اور کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان میں مجاہدوں کا سا جوش و جذبہ بھی ہے اور عاشقوں کا ایثار و قربانی کا حوصلہ بھی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب غلام سرور صاحب کے دورۂ حج کا سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے اپنے سفر کی صعوبتوں اور مسرتوں کو بڑے شگفتہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ غلام سرور صاحب چونکہ ایک سرگرم سیاسی کارکن بھی ہیں اس لیے کہیں کہیں سفرنامہ میں خطابت اور تقریر کا انداز بھی پیدا ہو گیا ہے اور بعض ایسی غیر متعلق باتیں بھی آگئی ہیں جن کا سفرنامہ سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اس سے اس سفرنامہ کی اہمیت اور افادیت کسی طرح مجروح نہیں ہوتی ہے۔

سفرنامہ بہر حال دلچسپ اور مطالعے کے لائق ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا